۲۰ر اکتوبر ۱۸۹۹ء

خطبہ جمعہ

تشہد و تعوذ کے بعد آپ نے سورۃ الدھر کے پہلے رکوع کی تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا:۔

یہ ایک وہ سورۃ شریف ہے جو جمعہ کے دن فجر کی نماز کی دوسری رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس میں اول اپنے ان احسانات کا تذکرہ فرماتا ہے جو مولیٰ کریم نے انسان پر کئے ہیں۔ اس تذکرہ کی وجہ یہ ہے کہ اگر آدمی کی فطرت اچھی ہو اور وہ سعادت مند ہو، فہیم ہو، عقل کی مار اس پر نہ پڑی ہو تو یہ بات ایسے انسان کی سرشت میں موجود ہے کہ جو کوئی اس پر احسان کرے تو محسن کی محبت طبعاً انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طبعی تقاضائے فطرت کی طرف ہمارے سید و مولیٰ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایما کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیْھَا (جامع الصغیر) یعنی انسانی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے محسن سے محبت کرتا ہے۔ اسی قاعدہ اور تقاضائے فطرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ طرز بھی اختیار کیا ہے کہ سعادت مندوں کو اپنے احسان و انعام یاد دلاتا ہے کہ وہ محبت الٰہی میں ترقی کر کے سعادت حاصل کریں۔ اندرونی

اور بیرونی انعامات پر غور کریں اور سوچیں تا ان کی جناب الٰہی سے محبت ترقی کرے۔ پھر یہ بات بھی انسان کی فطرت میں ہے کہ جب انسان کسی سے محبت بڑھالیتا ہے تو محبوب کی رضامندی کے لئے اپنا وقت' اپنا مال' اپنی عزت و آبرو غرض ہر عزیز سے عزیز چیز کو خرچ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ پس جب خدا تعالیٰ کے احسانات اور انعامات کے مطالعہ کی عادت پڑ جاوے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو گی اور روز بروز محبت بڑھے گی۔ اور جب محبت بڑھ گئی تو وہ اپنی تمام خواہشوں کو رضاء الٰہی کے لئے متوجہ کر سکے گا اور اس رضاء الٰہی کو ہر چیز پر مقدم سمجھ لے گا۔

دیکھو سب سے بڑا اور عظیم الشان احسان جو ہم پر کیا وہ یہ ہے کہ ہم کو پیدا کیا۔ اگر کوئی دوست مدد دیتا ہے تو ہمارے پیدا ہونے اور موجود ہونے کے بعد۔ اگر کوئی بھلی راہ بتلا سکتا ہے یا علم پڑھا سکتا ہے' مال دے سکتا ہے۔ غرض کہ کسی قسم کی مدد دیتا ہے تو پہلے ہمارا اور اس چیز کا اور دینے والے کا وجود ہوتا ہے تب جا کر وہ مدد دینے والا مدد دینے کے قابل ہوتا ہے۔ غرض تمام انعاموں کے حاصل کرنے سے پیشتر جو کسی غیر سے ہوں پہلا اور عظیم الشان احسان خدا تعالیٰ کا یہ ہے کہ اس نے ہم کو اور اس چیز کو جس سے ہمیں راحت پہنچی اور جس نے ہمیں راحت پہنچائی اس کو وجود عطا کیا۔ پھر صحت و تندرستی عطا کی۔ اگر ذرا بھی بیمار ہو جاوے تو تمام راحت رساں چیزیں بھی راحت رساں نہیں رہتیں۔ دانت درد کرے تو اس کو نکالنا پسند ہو جاتا ہے۔ آنکھ دکھ دینے کا باعث بن جاوے تو گاہے اس کو نکالنا ہی پڑتا ہے۔

برادران! جب بیماری لاحق ہوتی ہے تب پتہ لگتا ہے کہ صحت کیسا انعام تھا۔ اس صحت کے حاصل کرنے کو دیکھو کس قدر مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ طبیبوں کی خوشامد' دعاوالوں' تعویذ ٹوٹکے والوں کی منتیں' غرض قسم قسم کے لوگوں کے پاس جن سے کچھ بھی امید ہو سکتی ہے انسان جاتا ہے۔ دواؤں کے خرید کرنے میں کتنا ہی روپیہ خرچ کرنا پڑے بلا دریغ خرچ کرتا ہے۔ ایک آدمی مرنے لگتا ہے تو کہتے ہیں۔ دو باتیں کرا دو خواہ کچھ ہی لے لو۔ حالانکہ اس نے لاکھوں باتیں کیں۔

چونکہ ان لوگوں کو جو احسانات کا مطالعہ نہیں کرتے خبر بھی نہ تھی۔ غرض یہ سب انعامات جو ہم پر ہوتے ہیں ان میں سے اول اور بزرگ ترین انعام وجود کا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے پس اس سورۂ شریفہ میں اول اسی کا ذکر فرمایا۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (الدھر:۲) انسان پر کچھ زمانہ ایسا بھی گذرا ہے یا نہیں کہ یہ موجود نہ تھا۔

میری حالت کو دیکھو۔ اس وقت میں کھڑا بول رہا ہوں مگر کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ سو' اسی برس پیشتر میں کہاں تھا؟ اور میرا کیا مذکور تھا۔ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ یہ جناب الٰہی کا فیضان ہے کہ ایک ذرا سی چیز سے

انسان کو پیدا کیا۔ چنانچہ فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ (الدھر:۳) ہم نے انسان کو نطفہ سے بنایا۔ نطفہ میں صدہا چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان بنتا ہے۔ عام طور پر ہم لوگ ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ کوئی بڑی اعلیٰ درجہ کی خوردبین ہو تو اس کے ذریعہ سے وہ نظر آتے ہیں۔ پھر بتلایا کہ پہلا انعام تو عطاء وجود تھا پھر یہ انعام کیا فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔ خدا ہی کا فضل تھا کہ کان دیئے' آنکھیں دیں اور سنتا دیکھتا بنا دیا۔

سارے کمالات اور علوم کا پتہ کان سے لگ سکتا ہے یا نظارۂ قدرت کو دیکھ کر انسان باخبر ہو سکتا ہے۔ یہ عظیم الشان عطیے بھی کس کی جناب سے ملے؟ مولیٰ کریم ہی کی حضور سے ملے۔ آنکھیں ہیں تو نظارۂ قدرت کو دیکھتی ہیں۔ خدا کے پاک بندے اس کے پاک صحیفوں کو دیکھ کر حظ اٹھاتے ہیں۔ کان کے عطیہ کے ساتھ زبان کا عطیہ بھی آگیا۔ کیونکہ کان اگر نہ ہوں تو زبان پہلے چھن جاتی ہے۔ اب اگر ان میں سے کوئی نعمت چھن جاوے تو پتہ لگتا ہے کہ کیسی نعمت جاتی رہی۔ آنکھ بڑی نعمت ہے یا کان بڑی دولت ہے۔ ان عطیوں میں کوئی بیماری یا روگ لگ جاوے تو اس ذرا سے نقصان کی اصلاح کے لئے کس قدر روپیہ' وقت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ صحیح سالم' عمدہ' بے عیب' بے روگ عطیے اس مولیٰ کریم نے مفت بے مزد عنایت فرمائے ہیں۔ یوں نظر اٹھاتے ہیں تو وہ عجیب در عجیب تماشاہائے قدرت دیکھتے ہوئے آسمان تک چلی جاتی ہے۔ ادھر نظر اٹھاتے ہیں تو خوش کن نظارے دیکھتی ہوئی افق سے پار جا نکلتی ہے۔ کان کہیں دلکش آوازیں سن رہے ہیں' کہیں معارف وحقایق قدرت کی داستان سے حظ اٹھاتے ہیں' کہیں روحانی عالم کی باتوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ بیشک یہ مولیٰ کریم ہی کا فضل اور احسان ہے کہ ایسے انعام کرتا ہے۔ پیدا کرتا ہے اور پھر ایسی بے بہا نعمتیں عطا کرتا ہے۔ کسی کی ماں' کسی کا دوست' کسی کا باپ وہ نعمتیں نہیں دے سکتا جو خدا تعالیٰ نے دی ہیں۔

پھر اسی پر بس نہیں فرمائی۔ اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ (الدھر:۴) ہم نے انسان کو ایک راہ بتلائی۔ یہی ایک مسئلہ ہے جو بڑا ضروری تھا۔ ہم پیدا ہوئے سب کچھ ملا مگر کوئی کتنی کوششیں کرے ہمیشہ کے لئے نہ کوئی رہا ہے نہ رہے گا۔ سارے انبیاء و رسل' تمام اولیاء و کبراء ملت' تمام مدبر اور بڑے بڑے آدمی سب کے سب چل دئے۔ پس کوئی ایسا انعام ہو جو ابدالآباد راحت اور سرور کا موجب ہو۔ اس کے لئے فرمایا اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ ہم نے ایک راہ بتلائی' اگر اس پر چلے تو ابدالاباد کی راحت پا سکتا ہے۔ اس پاک راہ کی تعلیم ہمیشہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی معرفت ہوئی ہے۔ گو خود فطرت انسانی میں اس کے نقوش موجود ہیں۔ بہت مدت گذری جب کہ دنیا میں ایک عظیم الشان انسان اس پاک راہ کی

ہدایت کے لئے آیا جس کا نام آدم علیہ السلام تھا۔ پھر نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام آئے اور ان کے درمیان ہزاروں ہزار مامور من اللہ دنیا کی ہدایت کو آئے۔ اور ان سب کے بعد میں ہمارے سید و مولیٰ سید ولد آدم فخرالاولین و الآخرین افضل الرسل و خاتم النبیین حضرت محمد رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اور پھر کیسی رہنمائی فرمائی کہ ان کے ہی نمونہ پر ہمیشہ خلفاء امت کو بھیجتا رہا۔ حتیٰ کہ ہمارے مبارک زمانہ میں بھی ایک امام اس ہدایت کے بتلانے کے لئے مبعوث فرمایا۔ اور اس کو اور اس کے اقوال کو تائیدات عقلیہ اور نقلیہ و آیات ارضیہ و سماویہ سے موید فرما کر روز بروز ترقی عطا کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح الٰہی ہاتھ ایک انسان کی حفاظت کرتا ہے اور کس طرح آئے دن اس کے اعداء نیچا دیکھتے ہیں۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

ہاں تو پھر خدا کی ایک ممتاز جماعت ہمیشہ اپنے اقوال سے اس راہ کو بتلاتی اور اپنے اعمال سے نمونہ دکھلاتی ہے جس سے ابدی آرام عطاء ہو۔ پھر دیکھو کہ انعام الٰہی تو ہوتے ہیں مگر ان انعامات کو دیکھنے والے دو گروہ ہوتے ہیں اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا۔ (الدھر:۴)۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان ہدایات کی قدر کرتے ہیں اور ایک وہ ہوتے ہیں جو قدر نہیں کرتے ہیں۔ اور ان دستوروں پر عمل در آمد نہیں دکھاتے۔ ہمیشہ سے یہی طریق رہا ہے۔ ایک گروہ جو سعادتمندوں کا گروہ ہوتا ہے ان پاک راہوں کی قدر کرتا ہے اور اپنے عمل در آمد سے بتلا دیتا ہے کہ وہ فی الحقیقت اس راہ کے چلنے والے اور اس راہ کے ساتھ پیار کرنے والے ہیں اور دوسرے اپنے انکار سے بتلا دیتے ہیں کہ وہ قدر نہیں کرتے۔ یہ قرآن شریف جب آیا اور ہماری سید و مولیٰ، رسول اکرم، فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم اور پھر اپنے کامل اور پاک نمونہ سے ہدایت کی راہ بتلائی تو بہت سے نابکار، سعادت کے دشمن، انکار اور مخالفت پر تل پڑے۔ اور جو سعادت مند تھے وہ ان پر عمل کرنے کے لئے نکلے اور دنیا کے سرمایہ فخر و سعادت اور راحت و آرام ہوئے اور ان کے دشمن خائب و خاسر اور ہلاک ہوئے۔ آخر وہ سعادت کا زمانہ گزر گیا۔ دور کی باتیں کیا سناؤں۔ گھر کی اور آج کی بات کہتا ہوں۔ اب بھی اسی نمونہ پر ایک وقت لایا گیا اور وہی قرآن شریف پیش کیا گیا ہے۔ مگر سعادت مندوں نے قدر کی اور ناعاقبت اندیش نابکاروں نے ناشکری اور مخالفت۔

مگر نادان انسان کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انعام الٰہی کی ناقدری کرنے سے ہم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ دنیوی حکومت میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی حاکم کا حکم آجاوے اور پھر رعایا اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو سزایاب ہوتی ہے۔ نہ ماننے والوں کا آرام رنج سے اور ان کی عزت ذلت سے متبدل

ہو جاتی ہے۔ پھر اگر کوئی احکم الحاکمین کی بتائی راہ اپنا دستور العمل نہ بناوے تو کیونکر دکھوں اور ذلتوں سے بچ سکتا ہے۔

یاد رکھو کہ حکم حاکم کی نافرمانی حسب حیثیت حاکم ہوا کرتی ہے۔ یہ ذلت بھی اسی قدر ہو گی جس قدر کہ حاکم کے اختیارات ہیں۔

دنیا کے حاکم جو محدود حکومت رکھتے ہیں ان کی نافرمانی کی ذلت بھی محدود ہی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ جو غیر محدود اختیارات رکھتا ہے اس کے حکم کی خلاف ورزی میں ذلت بھی طویل ہو گی۔ گو یہ سچ ہے کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے مگر جیسی کہ اس کی طاقتیں وسیع ہیں اسی انداز سے نافرمان کی ذلت بھی ہونی چاہئے اور ہو گی۔ ہاں بہت سی سزائیں ایسی ہیں کہ انسان ان کو دیکھتا ہے اور بہت سی سزائیں ہیں کہ ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ تو غرض یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے قانون اور حکم کی اگر پرواہ نہ کریں گے تو کیا نقصان ہے؟ نہیں نہیں۔ خبردار ہو جاؤ۔ مولیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکَافِرِیْنَ سَلَاسِلَا وَ اَغْلَالًا وَّ سَعِیْرًا (الدھر:۵) منکر کو تین قسم کی سزا دیں گے۔

ہر ایک انسان کا جی چاہتا ہے کہ میں آزاد رہوں۔ جہاں میری خواہش ہو وہاں پہنچ سکوں۔ پھر چاہتا ہے کہ جہاں چاہوں حسب خواہش نظارہ ہائے مطلوبہ دیکھوں اور آخر جی کو خوش کروں۔ کہیں جانا پڑے تو جاؤں اور کہیں سے بھاگنا پڑے تو وہاں سے بھاگوں اور کسی چیز کو دیکھنا پڑے تو اسے دیکھوں۔ بہر حال اپنا دل ٹھنڈا رکھوں۔

پس یہ تین عظیم الشان امور ہیں۔ اگر کہیں جاتا ہے تو منشا ہے کہ دل خوش ہو۔ کسی کو دیکھتا ہے تو اس لئے کہ جان کو راحت ملے۔ نتیجہ بہر حال دل کی خوشی ہے مگر جب انسان خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر کرتا ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اولاً تین ہی نعمتوں کا ذکر کیا ہے عطاء وجود، عطاء سمع، عطاء بصر، ان نعمتوں سے اگر کوئی جاتی رہے تو کیا سچی خوشی اور حقیقی راحت مل سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ پھر خاص الخاص نعمت جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ملی ہے اس کے انکار سے کب راحت پا سکتا ہے؟ قانون الٰہی اور شریعت خداوندی کو توڑتا ہے کہ راحت ملے مگر راحت کہاں؟ دیکھ لو ایک نابکار انسان حدود اللہ کو توڑ کر زنا کا ارتکاب کرتا ہے کہ اسے لذت و سرور ملے۔ مگر نتیجہ کیا ہے کہ اگر آتشک اور سوزاک میں مثلاً مبتلا ہو گیا تو بجائے اس کے کہ جسم کو راحت و آرام پہنچاوے دل کو سوزش اور بدن کو جلن نصیب ہوتی ہے۔ قانون الٰہی کو

توڑنے والے کو راحت کہاں؟ پھر اس کے لئے اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ یعنی منکر انسان کے لئے کیا ہوتا ہے۔ پاؤں میں زنجیر ہوتی ہے' گردن میں طوق ہوتا ہے جن کے باعث انواع واقسام راحت و آرام سے محروم ہو جاتا ہے' دل میں ایک جلن ہوتی ہے جو ہر وقت اس کو کباب کرتی رہتی ہے۔ دنیا میں اس کا نظارہ موجود ہے مثلاً وہی نافرمان زانی' بدکار قسم قسم کے آلام جسمانی میں مبتلا ہو کر اندر ہی اندر کباب ہوتے ہیں اور پھر نہ وہاں جا سکتے ہیں نہ نظر اٹھا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اسی ہم و غم میں مصائب اور مشکلات پر قابو نہ پا کر آخر خودکشی کر کے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہدایت کے منکروں اور ہادیوں کے مخالفوں نے کیا پھل پایا؟

دیکھو! ہمارے سید و مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر جنہوں نے اس ابدی راحت اور خوشی کی راہ سے انکار کیا ان کا کیا حال ہوا؟ وہ عمائد مکہ جو ابوجہل' عتبہ' شیبہ وغیرہ تھے اور مقابلہ کرتے تھے وہ فاتح نہ کہلا سکے کہ وہ اپنے مفتوحہ بلاد کو دیکھتے اور دل خوش کر سکتے؟ ہرگز نہیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی عزت گئی' آبرو نہ رہی' مذہب گیا' اولاد ہاتھ سے گئی۔ غرض کچھ بھی نہ رہا۔ ان باتوں کو دیکھتے اور اندر ہی اندر کباب ہوتے تھے اور اسی جلن میں چل دیئے۔ یہ حال ہوتا ہے منکر کا۔ جب وہ خدا تعالیٰ کی کسی نعمت کا انکار کرتا ہے تو برے نتائج کو پالیتا ہے اور عمدہ نتائج اور آرام کے اسباب سے محروم ہو جاتا ہے۔[1]

پھر دوسرے گروہ اِمَّا شَاكِرًا (الدھر:۴) کا ذکر فرمایا کہ شکر کرنے والے گروہ کے لئے کیا جزا ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا۔ (الدھر:۶) بے شک ابرار لوگ کافوری پیالوں سے پییں گے۔

ابرار کون ہوتے ہیں؟ جن کے عقائد صحیح ہوں اور ان کے اعمال صواب اور اخلاص کے نیچے ہوں اور جو ہر دکھ اور مصیبت میں اپنے تئیں خدا تعالیٰ کی نارضامندی سے محفوظ رکھ لیں۔

خود جناب الٰہی ابرار کی تشریح فرماتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (البقرۃ:۱۷۸) ابرار کون ہوتے ہیں؟

اول جن کے اعتقاد صحیح ہوں کیونکہ اعمال صالحہ دلی ارادوں پر موقوف ہیں۔ دیکھو ایک اونٹ کے ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ایک بچہ بھی اسے جہاں چاہے' جدھر لے جائے' لئے جاتا ہے۔ لیکن اگر کنوئیں میں گرانا چاہیں تو خواہ دس آدمی بھی مل کر اس کی نکیل کو کھینچیں ممکن نہیں وہ قدم اٹھا جاوے۔ ایک حیوان مطلق بھی اپنے دلی ارادے اور اعتقاد کے خلاف کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ قدم اٹھایا

اور ہلاک ہوا۔ پھر انسان اور سمجھدار انسان کب اعتقاد صحیحہ رکھتا ہوا اعمال بد کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے ابرار کے لئے پہلے ضروری چیز یہی ہے کہ اعتقاد صحیحہ ہوں اور وہ پکی طرح پر اس کے دل میں جاگزیں ہوں۔ اگر منافقانہ طور پر مانتا ہے تو کاہل ہو گا حالانکہ مومن ہوشیار اور چالاک ہوتا ہے۔ ان اعتقادات صحیحہ میں سے پہلا اور ضروری عقیدہ خدا تعالیٰ کا ماننا ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام خوبیوں کا چشمہ ہے۔ دنیا میں ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب تک دوسرے سے مناسبت پیدا نہ ہو اس کی طاقتوں اور فضلوں سے برخوردار نہیں ہو سکتا۔ جب انسان قرب الٰہی چاہتا ہے اور اس کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے خاص فضل اور رحمتوں سے بہرہ ور اور برخوردار ہو جائے تو اسے ضروری ہے کہ ان باتوں کو چھوڑ دے جو خدا تعالیٰ میں نہیں یا جو اس کی پسندیدہ نہیں ہیں۔ جس قدر عظمت الٰہی دل میں ہو گی اسی قدر فرمان برداری کے خیالات پیدا ہوں گے اور رذائل کو چھوڑ کر فضائل کی طرف دوڑے گا۔ کیا ایک اعلیٰ علوم کا ماہر جاہل سے تعلق رکھ سکتا ہے یا ایک ظالم طبع انسان کے ساتھ ایک عادل مل کر رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس خدا تعالیٰ کی برکتوں سے برخوردار ہونے کے لئے سب سے ضروری بات صفات الٰہی کا علم حاصل کرنا اور ان کے موافق اپنا عمل درآمد کرنا ہے۔

اگر یہ اعتقاد بھی کمزور ہو تو ایک اور دوسرا مسئلہ ہے جس پر اعتقاد کرنے سے انسان خدا تعالیٰ کی فرماں برداری میں ترقی کر سکتا ہے وہ جزا و سزا کا اعتقاد ہے۔ یعنی افعال اور ان کے نتائج کا علم مثلاً یہ کام کروں گا تو نتیجہ یہ ہو گا۔ برے نتائج پر غور کر کے انسان' ہاں سعید الفطرت انسان برے کاموں سے جو ان نتائج بد کا موجب ہیں پرہیز کرے گا اور اعمال صالحہ بجالانے کی کوشش۔ یہ دونو اعتقاد نیکیوں کا اصل الاصول اور جڑیں ہیں یعنی اول خدا تعالیٰ کی صفات اور محامد کا اعتقاد اور علم تاکہ قرب الٰہی سے فائدہ اٹھاوے اور رذائل کو چھوڑ کر فضائل حاصل کرے۔

دوسرا یہ کہ ہر فعل ایک نتیجہ کا موجب ہوتا ہے۔ اگر بد افعال کا مرتکب ہو گا تو نتیجہ بد ہو گا۔ ہر انسان فطرتاً سکھ چاہتا ہے اور سکھ کے وسائل اور اسباب سے بے خبری کی وجہ سے افعال بد کے ارتکاب میں سکھ تلاش کرتا ہے مگر وہاں سکھ کہاں؟ اس لئے ضروری ہے کہ افعال اور ان کے نتائج کا علم پیدا کرے اور یہی وہ اصل ہے جس کو اسلام نے جزا و سزا کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان تجربہ کار اور واقف کار لوگوں کے بتلائے ہوئے مجرب نسخے آرام و صحت کے لئے چاہتا ہے۔ اگر کوئی ناواقف اور ناتجربہ کار بتلائے تو تامل کرتا ہے۔ پس نبوت حقہ نے جو راہ دکھلائی ہے وہ تیرہ سو برس سے تجربہ میں آ چکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راحت کے جو

سامان بتلائے ہیں ان کا امتحان کرنا آسان ہے۔

غور کرو اور بلند نظری سے کام لو! عرب کو کوئی فخر حاصل نہ تھا۔ کس سے ہوا؟ اسی نسخہ سے! کیا عرب میں تفرقہ نہ تھا؟ پھر کس سے دور ہوا؟ ہاں اسی راہ سے!! کیا عرب نابودگی کی حالت میں نہ تھے۔ پھر یہ حالت کس نے دور کی؟ ماننا پڑے گا کہ اسی نبوت حقہ نے!!!

عرب جاہل تھے' وحشی تھے' خدا سے دور تھے۔ محکوم نہ تھے تو حاکم بھی نہ تھے۔ مگر جب انہوں نے قرآن کریم کا شفابخش نسخہ استعمال کیا تو وہی جاہل دنیا کے استاد اور معلم بنے۔ وہی وحشی متمدن دنیا کے پیشرو اور تہذیب و شائستگی کے چشمے کہلائے۔ وہ خدا سے دور کہلانے والے خدا پرست اور خدا میں ہو کر دنیا پر ظاہر ہوئے۔ وہ جو حکومت کے نام سے بھی ناواقف تھے دنیا بھر کے مظفر و منصور اور فاتح کہلائے۔ غرض کچھ نہ تھے سب کچھ ہو گئے۔ مگر سوال یہی ہے کیونکر؟ اسی قرآن کریم کی بدولت' اسی دستور العمل کی رہبری سے۔ پس تیرہ سو برس کا ایک مجرب نسخہ موجود ہے جو اس قوم نے استعمال کیا جس میں کوئی خوبی نہ تھی اور خوبیوں کی وارث اور نیکیوں کی ماں بنی۔ غرض یہ مجرب نسخہ ہے کہ جس قدر خدا تعالیٰ کے قرب اور سکھ کی تلاش چاہو اسی قدر جن کے محامد الٰہیہ اور صفات باری تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ اسی قدر انسان رذائل سے بچے گا اور پسندیدہ باتوں کی طرف قدم اٹھائے گا۔

حاصل کلام' ابرار بننے کے لئے مندرجہ بالا اصول کو اپنا دستور العمل بنانا چاہئے۔ میں نے ذکر یہ شروع کیا تھا کہ شاکر گروہ کا دوسرا نام قرآن کریم نے ابرار رکھا ہے اور ان کی جزا یہ بتلائی ہے کہ کافوری پیالوں سے پیئیں گے۔ چنانچہ فرمایا اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا (الدھر:۶) پہلے ان کو اس قسم کا شربت پینا چاہئے کہ اگر بدی کی خواہش پیدا ہو تو اس کو دبا لینے والا ہو۔ کافور کہتے ہی دبا دینے والی چیز کو ہیں۔ اور کافور کے طبی خواص میں لکھا ہے کہ وہ سمی امراض کے مواد ردیہ اور فاسدہ کو دبا دیتا ہے اور اسی لئے وبائی امراض طاعون اور ہیضہ اور تپ وغیرہ میں اس کا استعمال بہت مفید ہے۔ تو پہلے انسان یعنی سلیم الفطرت انسان کو کافوری شربت مطلوب ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ (فاطر:۳۳) پھر وارث کیا ہم نے اپنی کتاب کا ان لوگوں کو جو برگزیدہ ہیں۔ پس بعض ان میں سے ظالموں کا گروہ ہے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں اور جبر و اکراہ سے نفس امارہ کو خدا تعالیٰ کی راہ پر چلاتے ہیں اور نفس سرکش کی مخالفت اختیار کر کے مجاہدات شاقہ میں مشغول ہیں۔

دوسرا گروہ میانہ رو آدمیوں کا ہے جو بعض خدمتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے نفس سرکش سے

بجبر و اکراہ لیتے ہیں اور بعض الٰہی کاموں کی بجا آوری میں نفس ان کا بخوشی خاطر تابع ہو جاتا ہے اور ذوق اور شوق اور محبت اور ارادت سے ان کاموں کو بجالاتا ہے۔ غرض یہ لوگ کچھ تو تکلیف اور مجاہدہ سے خدا تعالیٰ کی راہ پر چلتے ہیں اور کچھ طبعی جوش اور دلی شوق سے بغیر کسی تکلف کے اپنے رب جلیل کی فرماں برداری ان سے صادر ہوتی ہے۔

تیسرے سابق بالخیرات اور اعلیٰ درجہ کے آدمیوں کا گروہ ہے جو نفس امارہ پر بکلی فتحیاب ہو کر نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں۔

غرض سلوک کی راہ میں مومن کو تین درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے درجہ میں جب بدی کی عادت ہو تو اس کے چھوڑنے میں جان پر ظلم کرے اور اس قوت کو دباوے۔ شراب کا عادی اگر شراب کو چھوڑے گا تو ابتدا میں اس کو بہت تکلیف محسوس ہو گی۔ شہوت کے وقت عفت سے کام لے اور قوائے شہوانیہ کو دباوے۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا' سست' منافق' راستبازوں کے دشمنوں کو بدیاں چھوڑنے کے لئے جان پر ظلم کرنا پڑے گا تا کہ یہ اس طاقت پر فاتح ہو جائیں۔

بعد اس کے میانہ روی کی حالت آوے گی۔ کبھی کبھی بدی کے چھوڑنے میں گو کسی وقت کچھ خواہش بد پیدا بھی ہو جاوے' ایک لذت اور سرور بھی حاصل ہو جایا کرے گا مگر تیسرے درجہ میں پہنچ کر سابق بالخیرات ہونے کی طاقت آجاوے گی اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہونے لگے گی اور مکالمہ الٰہی کا شرف عطا ہو گا۔ تو سب سے پہلے ابرار کو کافوری شربت دیا جاوے گا تا کہ بدیوں اور رذائل کی قوتوں پر فتح مند ہو جاویں اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ بدیوں کو دباتے دباتے نیکیوں میں ترقی کرتا ہے اور پھر وہ ایک خاص چشمہ پر پہنچ جاتا ہے۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۔ (الدھر:۷) وہ ایک چشمہ ہے کہ اللہ کے بندے اس سے پیتے ہیں۔ صرف خود ہی فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ دوسروں کو بھی مستفید کرتے ہیں اور ان چشموں کو چلا کر دکھاتے ہیں۔

فطرت انسانی پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ تمام قویٰ پہلے کمزوری سے کام کرتے ہیں۔ چلنے میں' بولنے میں' پکڑنے میں' غرض ہر بات میں ابتداء لڑکپن میں کمزوری ہوتی ہے۔ لیکن جس قدر ان قوی سے کام لیتا ہے اسی قدر طاقت آجاتی ہے۔ پہلے دوسرے کے سہارے سے چلتا ہے پھر خود اپنے سہارے چلتا ہے۔ اسی طرح پہلے تتلا کر بولتا پھر نہایت صفائی اور عمدگی سے بولتا ہے' پکڑتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ گویا بتدریج نشو و نما پاتا ہے۔ اگر چند طاقتوں سے کام لینے کو چھوڑ دے تو وہ طاقتیں مردہ یا پژمردہ ضرور ہو جاتی ہیں۔ یہی معنی ہیں جب انسان بدی کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو طاقت کمزور ہو جاتی ہے اور نیکی کے

قوی بالکل ازکار رفتہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ظلم نہیں اگر کسی حاکم کو حکومت دی جاوے اور وہ فرائض منصبی کو ادا نہ کرے تو نگران گورنمنٹ اس کے وہ اختیارات سلب کر دے گی اور اسے معزول کرے گی اور اگر اس حالت کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی پروا نہ کرے تو یہ امر عاقبت اندیشی اور عقل کے خلاف ہے کہ سست انسان کے پاس رکھی جاوے۔ ایسے ہی وہ انسان ہے جو ایمانی قوی کو خرچ نہیں کرتا' وہ ابرار کے زمرہ میں رہ نہیں سکتا۔

جن کے عقائد حقہ ہیں یعنی وہ خدا پر ایمان لاتے ہیں۔ جزا و سزا اور خدا کی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر ان وسائط کو مانتے ہیں جن کا مقصود اتم فرمان برداری ہے۔ پھر عمل کے متعلق کیا چاہئے۔ سب سے زیادہ عزیز مال ہے۔ پانچ روپے کا سپاہی پانچ روپیہ کے بدلے میں عزیز جان دے دینے کو تیار ہے۔ ماں باپ اس روپیہ کے بدلے اس عزیز چہرہ کو جدا کر دیتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مال کی طرف انسان بالطبع جھکتا ہے۔ لیکن جب خدا سے تعلق ہو تو پھر مال سے بے تعلقی دکھاوے اور واقعی ضرورتوں والے کی مدد کرے۔ مسکینوں کو دے جو بیدست و پا ہیں۔ رشتہ داروں کی خبر لے۔ کوئی کسی ابتلا میں پھنس گیا ہو تو اس کے نکالنے کی کوشش کرے۔ مگر سب سے مقدم ذِی الْقُرْبٰی کو فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ ذِی الْقُرْبٰی کے ساتھ سلوک کرنا زیادتی عمر کا موجب ہے۔ یتیموں کی خبر لے۔ پھر جو بے دست و پا ہیں ان کی خبر لے۔ پھر جو علم پڑھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے پڑھتے ہیں اور مصیبت میں مبتلا شدہ لوگوں کی خبر لے۔ پس جناب الٰہی کے ساتھ تعلق ہو اور دنیا اور اس کی چیزوں سے بے تعلقی دکھلاوے۔ پھر جناب الٰہی کی راہ میں جان کو خرچ کرے۔

خدا تعالیٰ کی راہ میں جان خرچ کرنے کی پہلی راہ کیا ہے؟ نمازوں کا ادا کرنا۔ نماز مومن کا معراج ہے۔ نماز میں ہر قسم کی نیازمندیاں دکھائی گئی ہیں۔ غرض کافوری شربت پیتے پیتے انسان اس چشمہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے شفقت علی خلق اللہ کی توفیق دی جاتی ہے۔

پھر بتلایا کہ جو معاہدہ کسی سے کریں اس کی رعایت کرتے ہیں۔ مسلمان سب سے بڑا معاہدہ خدا سے کرتا ہے کہ میں نیک نمونہ ہوں گا۔ میں فرمان بردار ہوں گا۔ میں اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے کسی کو دکھ نہ دوں گا۔ اور ایسا ہی ہماری جماعت امام کے ہاتھ پر معاہدہ کرتی ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔ رنج میں' راحت میں' عسر یسر میں' قدم آگے بڑھاؤں گا۔ بغاوت اور شرارت کی راہوں سے بچنے کا اقرار کرتا ہے۔ غرض ایک عظیم الشان معاہدہ ہوتا ہے۔ پھر دیکھا جاوے کہ نفسانی اغراض اور دنیوی مقاصد کی

طرف قدم بڑھاتا ہے یا دین کو مقدم کرتا ہے۔ عامہ مخلوقات کے ساتھ نیکی اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً نیکی کرتا ہے یا نہیں؟

ہر امر میں خدا تعالیٰ کی رضا کو مقدم رکھے۔ مقدمہ ہو تو جھوٹے گواہوں' جعلی دستاویزوں سے محترز رہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وعظ کہنا بھی مفید امر ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو بھی درست بنا سکتا ہے۔ جب دوسرے کو نصیحت کرتا ہے تو اپنے دل پر چوٹ لگتی ہے۔

امر بالمعروف بھی ابرار کی ایک صفت ہے اور پھر قسم قسم کی بدیوں سے رکتا ہے۔ المختصر یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۔ جب خود بھلائی حاصل کرتے ہیں' ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ہوتے ہیں تو دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (الدھر:۸) جو معاہدہ جناب الٰہی سے کیا ہو اس کو وفاداری سے پورا کرے اور نیکی یوں حاصل کرے کہ میرے ہی افعال نتائج پیدا کریں گے۔

ایک فلسفی مسلمان کا قول ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الدھر:۹) اور کھانا دینے میں دلیر ہوتے ہیں۔ مسکینوں' یتیموں اور اسیروں کو کھلاتے ہیں۔ قرآن کریم میں لباس اور مکان دینے کی تاکید نہیں آئی جس قدر کھانا کھلانے کی آئی ہے۔ ان لوگوں کو خدا نے کافر کہا ہے جو بھوکے کو کہہ دیتے ہیں کہ میاں! تم کو خدا ہی دے دیتا اگر دینا منظور ہوتا۔ قرآن کریم میں سورۃ یٰسٓ میں ایسا لکھا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (یٰسٓ:۴۸)۔ آج کل چونکہ قحط ہو رہا ہے انسان اس نصیحت کو یاد رکھے اور دوسرے بھوکوں کی خبر لینے کو بقدر وسعت تیار رہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے یتیموں' مسکینوں اور پابند بلا کو کھانا دیتا رہے۔ مگر صرف اللہ کے لئے دے۔ یہ تو جسمانی کھانا ہے۔ روحانی کھانا ایمان کی باتیں' رضاء الٰہی اور قرب کی باتیں' یہاں تک کہ مکالمہ الٰہیہ تک پہنچا دینا' اسی رنگ میں رنگین ہونا ہے۔ یہ بھی طعام ہے۔ وہ جسم کی غذا ہے' یہ روح کی غذا۔

منشا یہ ہو کہ اس لئے کھانا پہنچاتے ہیں اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (الدھر:۱۱) کہ ہم اپنے رب سے ایک دن سے جو عبوس اور قمطریر ہے ڈرتے ہیں۔ عبوس تنگی کو کہتے ہیں۔ قمطریر دراز یعنی قیامت کا دن' تنگی کا ہو گا اور لمبا ہو گا۔ بھوکوں کی مدد کرنے سے خدا تعالیٰ قحط کی تنگی اور درازی سے بھی نجات دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا

(الدھر:۱۲) خدا تعالیٰ اس دن کے شر سے بچالیتا ہے اور یہ بچانا بھی سرور اور تازگی سے ہوتا ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ یاد رکھو آج کل کے ایام میں مسکینوں اور بھوکوں کی مدد کرنے سے قحط سالی کے ایام کی تنگیوں سے بچ جاؤ گے۔ خدا تعالیٰ مجھ کو اور تم کو توفیق دے کہ جس طرح ظاہری عزتوں کے لئے کوشش کرتے ہیں ابد الاباد کی عزت اور راحت کے لئے بھی کوشش کریں آمین۔

۱؎ (الحکم جلد ۳ نمبر ۳۸--- ۲۴/ اکتوبر ۱۸۹۹ء صفحہ ۳ تا ۶)

۲؎ (الحکم جلد ۳ نمبر ۴۱--- ۱۷/ نومبر ۱۸۹۹ء صفحہ ۱ تا ۴)

☆-☆-☆-☆